یادِ مجذوب

محمد رضا انصاری

شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے فرق کی بدولت مجذوب صاحب کے شخصیت نگار پر یہ ذمہ داری عاید نہیں ہوتی کہ وہ ان کا سن پیدائش، عمر اور سال وفات وغیرہ کی تفصیل بھی بیان کرے۔ جن میں سے ایک چیز بھی بدقسمتی سے میرے علم میں نہیں ہے۔ سن پیدائش اور عمر کے معاملے میں تو بعض بڑی بڑی شخصیتیں گمنامی کا شکار پائی جاتی ہیں، لیکن کسی نمایاں شخصیت کا سالِ وفات نہ معلوم ہونا یقیناً جہالت ہے، اس جہالت کا مجذوب صاحب کے بارے میں مجھے اعتراف ہے۔

عجیب اتفاق ہے، آخر جولائی یا شروع اگست ۱۹۴۳ء میں حیدر آباد کی ایک نجی صحبت میں جہاں کل ہند اردو کانگرس کے سلسلے میں حضرت جگر مرادآبادی کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ مجذوب صاحب کا جن کے بیشتر اشعار مجھے یاد ہیں، ذکر آگیا۔ جگر صاحب نے تفنناً کہا۔ "آپ کوئی دو شعر ان کے سنائیے، دیکھئے آپ کے ذوق کا

بھی امتحان ہے اس میں!"

ذوق کا ذکر جگر صاحب نے محض چھیڑنے کے لیے کیا تھا اس لیے کہ رسالہ "نیا ادب (لکھنؤ)" سے میری وابستگی اور ماہنامہ منزل (لکھنؤ) کی ادارت نے جگر صاحب کو جو "ترقی پسندوں کے ادبی ذوق" سے بدگمان سے رہتے تھے، میرے ذوق کا امتحان لینے کی دعوت دے دی۔ بہر حال دو شعر جو بر وقت یاد آگئے میں نے سُنائے ؎

گھٹا اُٹھی ہے تو بھی کھول زلف عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

یہ مطلع جس غزل کا ہے اس کا مقطع بھی ؎

الٰہی خیر ہو مجذوب مے خانے میں آیا ہے
قدح کش، لاابالی، جام نازک نازنیں ساقی

دیر تک مجذوب صاحب کا ذکر ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کسی کو ان کے بارے میں صحیح علم نہ تھا کہ وہ اب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ خط لکھنا مجذوب صاحب نے گویا سیکھا ہی نہیں تھا، حال معلوم ہو تو کیسے؟

واپسی پر کچھ دنوں کے بعد ایک دفعہ ضمناً مجذوب صاحب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اپنے وطن اورئی ضلع جالون میں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخ انتقال بھی اگست ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ ہے۔ اس وقت ذہن پر زور دے کر حساب لگایا تھا اور غالباً وہی تاریخ یا ایک آدھ دن آگے پیچھے کی تاریخ تھی جب حیدرآباد میں مجذوب صاحب کی یاد ہم لوگوں کو آئی تھی۔

بھی امتحان ہے اس میں!"

ذوق کا ذکر جگر صاحب نے محض چھیڑنے کے لیے کیا تھا اس لیے کہ رسالہ نیا ادب (لکھنؤ) سے میری وابستگی اور ماہنامہ منزل (لکھنؤ) کی ادارت نے جگر صاحب کو جو "ترقی پسندوں کے ادبی ذوق" سے بدگمان سے رہتے تھے، میرے ذوق کا امتحان لینے کی دعوت دے دی۔ بہرحال دو شعر جو بروقت یاد آگئے میں نے سُنائے ؎

گھٹا اُٹھی ہے تو بھی کھول زلف عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

یہ مطلع جس غزل کا ہے اس کا مقطع بھی ؎

الٰہی خیر ہو مجذوب مے خانے میں آیا ہے
قدح کش، لاابالی، جام نازک نازنیں ساقی

دیر تک مجذوب صاحب کا ذکر ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کسی کو ان کے بارے میں صحیح علم نہ تھا کہ وہ اب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ خط لکھنا مجذوب صاحب نے گویا سیکھا ہی نہیں تھا، حال معلوم ہو تو کیسے؟۔

واپسی پر کچھ دنوں کے بعد ایک دفعہ ضمناً مجذوب صاحب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اپنے وطن اورئی ضلع جالون میں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخ انتقال بھی اگست ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ ہے۔ اس وقت ذہن پر زور دے کر حساب لگایا تھا اور غالباً وہی تاریخ یا ایک آدھ دن آگے پیچھے کی تاریخ تھی جب حیدرآباد میں مجذوب صاحب کی یاد ہم لوگوں کو آئی تھی۔

مجذوب صاحب سخت قسم کے متشرع بھی تھے اور صوفی بھی، صوفی صرف شاعرانہ حد تک نہیں، بلکہ واقعتاً اپنے وقت کے ایک بڑے شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید خاص اور خلیفہ بھی تھے۔ شیخؒ کے انتقال کے بعد خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں متوسلین کے حالات و کوائف کے نگراں اور مشیر بھی۔

تو وہ مذہبی بھی تھے، صوفی بھی، سرکاری افسر بھی تھے اور سرکاری فہرستوں میں "خاں صاحب" اور "خان بہادر" بھی۔ پھر بھی میں انھیں سرتاپا شاعر کہنے کی جسارت کر رہا ہوں ـــــ شاعری اگر صرف قافیہ پیمائی کا نام نہیں، بلکہ اس کیفیت، اس شعور اور اس احساس کا نام ہے جو ہر شاعر میں کم و بیش پایا جاتا اور اس سے شعر کہلاتا ہے تو مجذوب صاحب پر یہ کیفیت اور یہ جذبہ ہمہ وقت طاری رہتا تھا۔ اگر ان کے دوسرے فرائض اس کیفیت کے اظہار میں رکاوٹ بنتے تو ایک سخت قسم کی بے چینی ان کے ہر بن مو سے ٹپکتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بے چینی کو محسوس کرنے والا پوری طرح جان لیتا تھا کہ اس میں نہ بناوٹ ہے اور نہ دکھاوا۔

ہم دو تین "صاحبزادگان" فرنگی محل (بہ لحاظ عمر نہ بغرض احترام) مجذوب صاحب کی تلاش میں ان کے مکان واقع بنارسی باغ مغرب کے بعد پہونچے، سنہ ۴۵ء کے آس پاس کی بات ہوگی، اس وقت مجذوب صاحب انسپکٹر آف اسکولز ہو چکے تھے اور خاں صاحب خواجہ عزیز الحسن غوری انسپکٹر آف اسکولز (یو، پی) کہلاتے تھے۔ مکان یعنی سرکاری بنگلے میں وہ ملے نہیں، معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے گئے ہیں۔ دیر تک ہم نے ٹہل ٹہل کر انتظار کیا آخر اس مسجد تک پہونچ گئے جہاں وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ وہ مسجد کے صحن میں دو زانو بیٹھے ایک طرف گردن ڈھلکائے اور اسے شانے پر ٹکائے تسبیح پڑھ رہے تھے۔

مجذوب صاحب سخت قسم کے متشرع بھی تھے اور صوفی بھی، صوفی صرف شاعرانہ حد تک نہیں، بلکہ واقعاً اپنے وقت کے ایک بڑے شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید خاص اور خلیفہ بھی تھے۔ شیخؒ کے انتقال کے بعد خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں متوسلین کے حالات و کوائف کے نگراں اور مشیر بھی۔

تو وہ مذہبی بھی تھے، صوفی بھی، سرکاری افسر بھی تھے اور سرکاری فہرستوں میں "خاں صاحب" اور "خان بہادر" بھی۔ پھر بھی میں انھیں سرتاپا شاعر کہنے کی جسارت کر رہا ہوں ___ شاعری اگر صرف قافیہ پیمائی کا نام نہیں، بلکہ اس کیفیت، اس شعور اور اس احساس کا نام ہے جو ہر شاعر میں کم و بیش پایا جاتا اور اس سے شعر کہلاتا ہے تو مجذوب صاحب پر یہ کیفیت اور یہ جذبہ ہمہ وقت طاری رہتا تھا۔ اگر ان کے دوسرے فرائض اس کیفیت کے اظہار میں رکاوٹ بنتے تو ایک سخت قسم کی بے چینی ان کے ہر بن مو سے ٹپکتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بے چینی کو محسوس کرنے والا پوری طرح جان لیتا تھا کہ اس میں نہ بناوٹ ہے اور نہ دکھاوا۔

ہم دو تین "صاحبزادگان" فرنگی محل (بہ لحاظ عمر نہ بغرض احترام) مجذوب صاحب کی تلاش میں ان کے مکان واقع بنارسی باغ مغرب کے بعد پہونچے، سنہ ء کے آس پاس کی بات ہوگی، اس وقت مجذوب صاحب انسپکٹر آف اسکولز ہو چکے تھے اور خاں صاحب خواجہ عزیز الحسن غوری انسپکٹر آف اسکولز (یو، پی) کہلاتے تھے۔ مکان یعنی سرکاری بنگلے میں وہ ملے نہیں، معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے گئے ہیں۔ دیر تک ہم نے ٹہل ٹہل کر انتظار کیا آخر اس مسجد تک پہونچ گئے جہاں وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ وہ مسجد کے صحن میں دو زانو بیٹھے ایک طرف گردن ڈھلکائے اور اسے شانے پر ٹکائے تسبیح پڑھ رہے تھے۔

ظاہر و باطن دونوں کے عین مطابق تھی۔

مجذوب صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز ہو کر لکھنؤ میں متعین ہوئے تو ان کا قیام وکٹوریہ اسٹریٹ پر ہوا۔ یعنی ہمارے اور ان کے گھروں کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی۔ یہ نہیں معلوم اور نہ میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کب سے ہمارے پڑوسی تھے۔ لیکن ۳۱ء یا ۳۲ء میں پہلے پہل ان کا ان کی شاعری اور ان کی والہانہ زندگی کا ذکر اپنے چچا مولانا صبغت اللہ شہید صاحب کی زبانی سُنا جو ایک دوسرے عزیز سے کہہ رہے تھے اور میں اپنے ساتھیوں سمیت نحو میر یا فصول اکبری کا سبق پڑھنے بیٹھا ہوا تھا۔

انھوں نے کہا کہ "سڑک پر ایک ہجوم دیکھ کر میں اس طرف بڑھا تو دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب کھڑے جھوم جھوم کر اور رقص کر کر کے گا رہے ہیں، مجھے دیکھ کر چونکے اور بولے "آئیے آئیے آپ حضرات اہل علم ہیں۔" میں قریب چلا گیا۔ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک کبھی اس غزل کے اور کبھی اس غزل کے اشعار بلا لحاظ ترتیب سناتے رہے۔"

عجیب و غریب "تعارف" تھا یہ! سڑک پر ایک آدمی جھومے ناچے! یہاں یہ تربیت دی گئی تھی کہ اکیلے سڑک پر نہ جاؤ۔ کسی سے سڑک پر بات نہ کرو۔ شیروانی کے بغیر گھر سے قدم نہ نکالو، سودا خود نہ خریدو، وغیرہ وغیرہ۔ بڑا زبردست تضاد تھا ہماری معاشرت اور اس شاعر کے طور طریقوں میں! ایک ولولہ سا اٹھا ایسے آدمی سے ملنے کا، اس کی شاعری کے شوق میں نہیں، ۱۴ برس کی عمر اور نحو میر کی استعداد رکھتے کس کو شاعری کی سوجھ بوجھ ہو سکتی ہے؟۔ اس عجیب و غریب شخصیت کو دیکھنے کی گدگدی ضرور ہوئی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ آج رات کو وہ آئیں گے اور ایک نشست ہو گی تو ہم خوش

ظاہر و باطن دونوں کے عین مطابق تھی۔

مجذوب صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز ہو کر لکھنؤ میں متعین ہوئے تو ان کا قیام وکٹوریہ اسٹریٹ پر ہوا۔ یعنی ہمارے اور ان کے گھروں کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی۔ یہ نہیں معلوم اور نہ میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کب سے ہمارے پڑوسی تھے۔ لیکن ۱۹۳۰ء یا ۳۱ء میں پہلے پہل ان کا ان کی شاعری اور ان کی والہانہ زندگی کا ذکر اپنے چچا مولانا صبغت اللہ شہید صاحب کی زبانی سُنا جو ایک دوسرے عزیز سے کہہ رہے تھے اور میں اپنے ساتھیوں سمیت نحو میر یا فصول اکبری کا سبق پڑھنے بیٹھا ہوا تھا۔

انھوں نے کہا کہ "سڑک پر ایک ہجوم دیکھ کر میں اس طرف بڑھا تو دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب کھڑے جھوم جھوم کر اور رقص کر کر کے گا رہے ہیں، مجھے دیکھ کر چونکے اور بولے "آئیے آئیے آپ حضرات اہل علم ہیں"۔ میں قریب چلا گیا۔ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک کبھی اس غزل کے اور کبھی اس غزل کے اشعار بلا لحاظ ترتیب سناتے رہے"۔

عجیب و غریب "تعارف" تھا یہ! سڑک پر ایک آدمی جھومے ناچے! یہاں یہ تربیت دی گئی تھی کہ اکیلے سڑک پر نہ جاؤ۔ کسی سے سڑک پر بات نہ کرو۔ شیروانی کے بغیر گھر سے قدم نہ نکالو، سودا خود نہ خریدو، وغیرہ وغیرہ۔ بڑا زبردست تضاد تھا ہماری معاشرت اور اس شاعر کے طور طریقوں میں! ایک ولولہ سا اٹھا ایسے آدمی سے ملنے کا، اس کی شاعری کے شوق میں نہیں، ۱۴ برس کی عمر اور نحو میر کی استعداد رکھتے کس کو شاعری کی سوجھ بوجھ ہو سکتی ہے؟۔ اس عجیب و غریب شخصیت کو دیکھنے کی گدگدی ضرور ہوئی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ آج رات کو وہ آئیں گے اور ایک نشست ہوگی تو ہم خوش

پڑ گئی تھی ان پہ بھولے سے نظر — بات اتنی سی، قیامت ہو گئی
ایسی ضد کا کیا ٹھکانا ہے بھلا — بات جو کہہ دی وہ قسمت ہو گئی
جی رہا ہوں موت کی امید میں — مر ہی جاؤں گا جو صحت ہو گئی
رنج دینے سے وہ باز آئے تو کب — جب کہ غم کھانے کی عادت ہو گئی
خاک میں کس نے ملایا یہ تو دیکھ — شکر کر مٹی سوارت ہو گئی

کر چکے رندی بس اب مجذوبؔ تم
ایک چلو میں یہ حالت ہو گئی"

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا سب ہی اشعار ایک درجے کے نہیں یا سب بلند پایہ اشعار نہیں کہے جا سکتے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب مجذوبؔ صاحب خود سنا رہے ہوں تو بڑے سے بڑے منکر کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ اس کیفیت میں جذب ہو کر جو خود مجذوبؔ صاحب پر طاری رہتی تھی، ایک ایک شعر پر سر نہ دھننے لگے۔

ذرا اے ناصح فرزانہ! چل کر سُن تو دو باتیں
نہ ہوگا پھر بھی تو مجذوبؔ کا دیوانہ؟ دیکھوں گا!

مجذوبؔ صاحب کے پڑھنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ ٹھیک وہی جس کی طرف میر سوزؔ کے تذکرے میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزادؔ نے "آبِ حیات" میں اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:-

"انھوں نے (میر سوزؔ نے) علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لطف دو چند ہو جاتا تھا، شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے۔ اور لوگ بھی نقل

پڑ گئی تھی ان پہ بھولے سے نظر | بات اتنی سی ؛ قیامت ہوگئی
ایسی ضد کا کیا ٹھکانا ہے بھلا | بات جو کہہ دی وہ قسمت ہوگئی
جی رہا ہوں موت کی امید میں | مر ہی جاؤں گا جو صحت ہوگئی
رنج دینے سے وہ باز آئے تو کب | جب کہ غم کھانے کی عادت ہوگئی
خاک میں کس نے ملایا یہ تو دیکھ | شکر کر مٹی سوارت ہوگئی

کر چکے رندی بس اب مجذوب تم
ایک چلو میں یہ حالت ہوگئی؟

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا سب ہی اشعار ایک درجے کے نہیں یا سب بلند پایہ اشعار نہیں کہے جا سکتے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب مجذوب صاحب خود سنا رہے ہوں تو بڑے سے بڑے منکر کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ اس کیفیت میں جذب ہو کر جو خود مجذوب صاحب پر طاری رہتی تھی، ایک ایک شعر پر سر نہ دھننے لگے۔

ذرا اے ناصح فرزانہ! چل کر سُن تو دو باتیں
نہ ہوگا پھر بھی تو مجذوب کا دیوانہ؟ دیکھوں گا!

مجذوب صاحب کے پڑھنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ ٹھیک وہی جس کی طرف میر سوز کے تذکرے میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"انھوں نے (میر سوز نے) علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لطف دو چند ہو جاتا تھا، شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے۔ اور لوگ بھی نقل

نہیں دیکھا۔ جس طرح بقول مولانا آزاد "میر سوز نے ایک خاص موقعہ پر عجب انداز سے حسب ذیل قطعہ پڑھا۔

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے — سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

وہاں دیکھے کئی طفل پری رو — ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے وہیں زمین پر گر پڑے گویا پری زادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہوگیا ہے اور ایسے نڈھال ہوئے کہ ارے رے رے کہتے کہتے غش کھاکر بیہوش ہوگئے۔"

لیکن مجذوب صاحب کے حرکات و سکنات تھے کچھ اسی طرح کے، غزل سنائے تھے "کہیں ہوتی" "نہیں ہوتی" جب یہ شعر پڑھا ؎

ہٹاتے ہم نشیں ہر چند لیکن چشم گریاں پر
کبھی یہ آستیں ہوتی کبھی یہ آستیں ہوتی

تو پہلے داہنی آستین چشم گریاں پر رکھ لی، پھر گویا ہم نشین نے ہاتھ ہٹا دیا تو بائیں آستین اس کی جگہ رکھ لی۔

ایک دفعہ یہ شعر پڑھا ؎

ہنس بھی دو ہنس بھی دو، ہاں ہاں چلو بس روٹھ چکے
اب ہنسے، اب ہنسے، دیکھو وہ ہنسی آئی ہے

"دیکھو وہ ہنسی آئی ہے" جب بھی کہا اس طرح کہا کہ جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا اس کو ہنسی آکے رہی۔

انھوں نے جب سنایا ؎

نہیں دیکھا۔ جس طرح بقول مولانا آزاد "میر سوز نے ایک خاص موقعہ پر عجب انداز سے حسب ذیل قطعہ پڑھا۔

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے — سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پری رو — ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے وہیں زمین پر گر پڑے گویا پری زادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو گیا ہے اور ایسے نڈھال ہوئے کہ ارے رے کہتے کہتے غش کھا کر بیہوش ہو گئے۔"

لیکن مجذوب صاحب کے حرکات و سکنات تھے کچھ اسی طرح کے، غزل سنائے تھے "کہیں ہوتی" "نہیں ہوتی" جب یہ شعر پڑھا ؎

ہٹاتے ہم نشیں ہر چند لیکن چشم گریاں پر
کبھی یہ آستیں ہوتی کبھی یہ آستیں ہوتی

تو پہلے داہنی آستین چشم گریاں پر رکھ لی، پھر گویا ہم نشین نے ہاتھ ہٹا دیا تو بائیں آستین اس کی جگہ رکھ لی۔

ایک دفعہ یہ شعر پڑھا ؎

ہنس بھی دو ہنس بھی دو، ہاں ہاں چلو بس روٹھ چکے
اب ہنسے، اب ہنسے، دیکھو وہ ہنسی آئی ہے

"دیکھو وہ ہنسی آئی ہے" جب بھی کہا اس طرح کہا کہ جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا اس کو ہنسی آ کے رہی۔

انھوں نے جب سنایا ؎

گے اور سناتے رہیں گے، متابعت کرنے والوں کو ان کے اشعار کشاں کشاں ان کے گھر تک پہونچا دیں گے۔ جب تک گھر کا دروازہ کھلے مجذوب صاحب سناتے جائیں گے یہاں تک کہ وہ گھڑی دیکھ کر ایک دفعہ زور سے استغفراللہ کہیں گے گویا نماز کا وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے اور جلدی جلدی اپنے مکان کے زینے پر چڑھ جائیں گے، اس طرح محفل برخاست ہوتی تھی۔ ایک دو بار کی بات نہیں ہے ہمیشہ یہ بھی ہوا ہے کہ مجذوب صاحب کو سکون نہیں ہوا۔ بے چینی اور اضطراب کا عالم طاری ہے، دیکھا نماز فجر کے بعد پھر گنگناتے چلے آ رہے ہیں اور پھر ان کی صدا پر یا اطلاع پر ہر طرف سے لوگ لپک لپک کر آ رہے ہیں۔ بقول مجذوب صاحب کے ؎

آ رہے ہیں ہر طرف سے طالبانِ دردِ دل!

یہ مری آہ و فغاں ہے یا اذانِ دردِ دل؟

یہ تو آٹھ نو گھنٹے کی نشست تھی، ایک دفعہ لگاتار ۴۸ گھنٹے کی نشست ہوئی جس میں نماز اور کھانے چائے کے علاوہ کوئی وقفہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی یہی محسوس ہوا کہ نہ سنانے والا تھکا اور نہ داستان مکمل ہوئی۔

۴۸ گھنٹے کی نشست فرنگی محل کے ایک قدیم متوسل قاضی وحیدالدین صاحب کے یہاں ستر کھ ضلع بارہ بنکی میں ہوئی تھی، اور سب لوگ لکھنؤ سے لد پھند کر وہاں پہونچے تھے۔

قاضی صاحب کے ایک قدیم ملازم نے گھر والوں اور مہمانوں کا جو یہ حال دیکھا کہ نہ کھانے کا ہوش نہ سونے کی فکر، بس ایک "بڈھا" گا رہا ہے اور سب میاں لوگ جھوم رہے ہیں تو اسے عجیب معلوم ہوا۔ اس نے بڑی حیرت سے کہا "ایک سڑی تو خیر ہے رہنا ہی،

گے اور سناتے رہیں گے، متابعت کرنے والوں کو ان کے اشعار کشاں کشاں ان کے گھر تک پہونچادیں گے۔ جب تک گھر کا دروازہ کھلے مجذوب صاحب سناتے جائیں گے یہاں تک کہ وہ گھڑی دیکھ کر ایک دفعہ زور سے استغفر اللہ کہیں گے گویا نماز کا وقت تنگ ہوتا جارہا ہے اور جلدی جلدی اپنے مکان کے زینے پر چڑھ جائیں گے، اس طرح محفل برخاست ہوتی تھی۔ ایک دو بار کی بات نہیں ہے ہمیشہ یہ بھی ہوا ہے کہ مجذوب صاحب کو سکون نہیں ہوا۔ بے چینی اور اضطراب کا عالم طاری ہے، دیکھا نماز فجر کے بعد پھر گنگناتے چلے آرہے ہیں اور پھر ان کی صدا پر یا اطلاع پر ہر طرف سے لوگ لپک لپک کر آرہے ہیں۔ بقول مجذوب صاحب کے ؎

آرہے ہیں ہر طرف سے طالبانِ دردِ دل!

یہ مری آہ و فغاں ہے یا اذانِ دردِ دل؟

یہ تو آٹھ نو گھنٹے کی نشست تھی، ایک دفعہ لگاتار ۴۸ گھنٹے کی نشست ہوئی جس میں نماز اور کھانے چائے کے علاوہ کوئی وقفہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی یہی محسوس ہوا کہ نہ سنانے والا تھکا اور نہ داستان مکمل ہوئی۔

۴۸ گھنٹے کی نشست فرنگی محل کے ایک قدیم متوسل قاضی وحید الدین صاحب کے یہاں ستر کھ ضلع بارہ بنکی میں ہوئی تھی، اور سب لوگ لکھنؤ سے لد پھند کر وہاں پہونچے تھے۔

قاضی صاحب کے ایک قدیم ملازم نے گھر والوں اور مہمانوں کا جو یہ حال دیکھا کہ نہ کھانے کا ہوش نہ سونے کی فکر، بس ایک "بڈھا" گا رہا ہے اور سب میاں لوگ جھوم رہے ہیں تو اسے عجیب معلوم ہوا۔ اس نے بڑی حیرت سے کہا "ایک سٹری تو خیر ہے رہنا ہی،

یا تو ہم کو بھی اجازت ہو نہیں بہر کرم
اس تصور کو بھی رکو ائیے دربانوں سے

شوق سے مٹھیاں بھر بھر کے مجھے مٹی دی
آج تو لاد دیا آپ نے احسانوں سے

کس قدر ہوش رُبا ہوتا ہے پُر درد کلام
پوچھے گُفتۂ مجذوب کے دیوانوں سے

ابھی گُفتۂ مجذوب کے دیوانے ہوش ربائی کی کارفرمائیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مجذوب صاحب پہلی غزل کی طرف لوٹ گئے اور ایک نیا مطلع سنایا ؎

اک عمر سے الجھن میں مری جانِ حزیں ہے
یہ بھی ہے کوئی بات کہ "ہاں" ہو نہ "نہیں" ہے

اسی غزل میں انھوں نے کہا تھا ؎

اُف عکس کشِ حُسن ہیں کیسی مری آنکھیں
کھُپ جاتا ہو نظروں میں ذرا بھی جو حسیں ہے

درحقیقت مجذوب صاحب حُسن کے دیوانے تھے، انسانوں سے لے کر حیوانوں تک جہاں بھی انھیں حسن کا جلوہ نظر آتا وہ آپے سے باہر ہو جاتے۔

ایسی ہی ایک محفل میں مجذوب صاحب کی سحری کے لیے آم لائے گئے، عشار کے بعد سے تین بجے رات تک وہ مولانا قطب میاں صاحب (مرحوم) کے یہاں سناتے رہے تھے۔ دوسرے دن مجذوب صاحب کو روزہ رکھنا تھا گھر جا کر سحری کرتے امولانا قطب میاں صاحب نے اپنے یہاں انتظام کر دیا تاکہ تھوڑی دیر اور مجذوب صاحب کا سنانا جاری رہے۔ بمشکل سادی جائے پر مجذوب صاحب رضامند ہوئے۔ تھوڑے سے آم بھی تھے، تر و تازہ، خوش رنگ، اور سڈول، بس مجذوب صاحب بچین

یا تو ہم کو بھی اجازت ہو نہیں بہر کرم اس تصور کو بھی رکو لیجیے دربانوں سے

شوق سے مٹھیاں بھر بھر کے مجھے مٹی دی آج تو لاد دیا آپ نے احسانوں سے

کس قدر ہوش رُبا ہوتا ہے پُر درد کلام

پوچھیے گفتۂ مجذوب کے دیوانوں سے

ابھی گفتۂ مجذوب کے دیوانے ہوش ربائی کی کارفرمائیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مجذوب صاحب پہلی غزل کی طرف لوٹ گئے اور ایک نیا مطلع سنایا ؎

اک عمر سے الجھن میں مری جانِ حزیں ہے

یہ بھی ہے کوئی بات کہ "ہاں" ہو نہ "نہیں" ہے

اسی غزل میں انھوں نے کہا تھا ؎

اُف عکس کشِ حسن ہیں کیسی مری آنکھیں

کھُپ جاتا ہو نظروں میں ذرا بھی جو حسیں ہے

درحقیقت مجذوب صاحب حسن کے دیوانے تھے، انسانوں سے لے کر حیوانوں تک جہاں بھی انھیں حسن کا جلوہ نظر آتا وہ آپے سے باہر ہو جاتے۔

ایسی ہی ایک محفل میں مجذوب صاحب کی سحری کے لیے آم لائے گئے، عشاء کے بعد سے تین بجے رات تک وہ مولانا قطب میاں صاحب مرحوم کے یہاں سناتے رہے تھے۔ دوسرے دن مجذوب صاحب کو روزہ رکھنا تھا گھر جا کر سحری کرتے امولانا قطب میاں صاحب نے اپنے یہاں انتظام کر دیا تاکہ تھوڑی دیر اور مجذوب صاحب کا سنانا جاری رہے۔ بمشکل سادی جائے پر مجذوب صاحب رضامند ہوئے۔ تھوڑے سے آم بھی تھے، تر و تازہ، خوش رنگ، اور سڈول، بس مجذوب صاحب بےچین

یا سہ

پڑے اُف نہ کمسن حسینوں سے پالا — وہ معصوم نظریں وہ منھ بھولا بھالا
دُہائی ہے دردِ محبت! دہائی! — ارے مار ڈالا! ارے مار ڈالا!

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں سہ

آتا ہو نظر حسن ہی جاتے ہیں جدھر ہم — کیا پھوڑ لیں اب آنکھیں ہی اے حسن نظر ہم
اُف پڑ ہی گئی اک بُت کافر پہ نظر آج — رکھتے تھے اسی ڈر سے تو نیچی ہی نظر ہم

ایک صاحب نے پوچھ لیا "یہ کون بُت کافر ہے۔" فوراً ہی مجذوب صاحب نے دوسرا شعر پڑھا سہ

اتنی تو خبر ہے کہ کوئی ہوش رُبا تھا — رکھتے نہیں کچھ اس کے سوا اور خبر ہم

اسی غزل میں ایک شعر ہے سہ

در پردہ کوئی پردہ نشیں دیکھ لیا ہے — اب حور بھی آجائے تو ڈالیں نہ نظر ہم

محترم مولانا عبد الماجد دریابادی تشریف فرما تھے۔ ۳۲ء یا ۳۳ء کی بات ہے مولانا کی غیرت دینی معمولی بھول چوک پر بھی گرفت کیے بغیر نہیں رہ پاتی وہ جن مرحلوں سے گزر کر آئے تھے غالباً اس کا فطری نتیجہ تھا کہ سخت قسم کا تقشف ان کا نگہبان بن جائے۔ ہم فرنگی محلیوں کا مسلک یہ کہ سماع، عرس، اور زیارت قبور کے لیے شدِّ رحال وغیرہ بھی ممنوع نہیں۔ غرض مولانا عنایت اللہ صاحب (فرنگی محلی) اور مولانا دریابادی میں کچھ شعر و شاعری کے مضمرات پہ نوک جھونک ہو رہی تھی۔ مجذوب صاحب نے جب کہا "اب حور بھی آجائے تو ڈالیں نہ نظر ہم" مولانا عنایت اللہ صاحب نے تعریف کرتے ہوئے مولانا دریابادی سے کچھ کہا۔ مولانا عبد الماجد صاحب نے جواب

یا سے

پڑے اُف نہ کمسن حسینوں سے پالا / وہ معصوم نظریں وہ منھ بھولا بھالا
دہائی ہو دردِ محبت! دہائی! / ارے مار ڈالا! ارے مار ڈالا!

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں سے

آتا ہو نظر حسن ہی جاتے ہیں جدھر ہم / کیا پھوڑلیں اب آنکھیں ہی اے حسنِ نظر ہم
اُف پڑ ہی گئی اک بُتِ کافر پہ نظر آج / رکھتے تھے اسی ڈر سے تو نیچی ہی نظر ہم

ایک صاحب نے پوچھ لیا "یہ کون بُتِ کافر ہے"۔ فوراً ہی مجذوب صاحب نے دوسرا شعر پڑھا سے

اتنی تو خبر ہے کہ کوئی ہوش رُبا تھا / رکھتے نہیں کچھ اس کے سوا اور خبر ہم

اسی غزل میں ایک شعر ہے سے

در پردہ کوئی پردہ نشیں دیکھ لیا ہے / اب حور بھی آجائے تو ڈالیں نہ نظر ہم

محترم مولانا عبدالماجد دریابادی تشریف فرما تھے۔ ۳۲ء یا ۳۳ء کی بات ہے مولانا کی غیرت دینی معمولی بھول چوک پر بھی گرفت کیے بغیر نہیں رہ پاتی وہ جن مرحلوں سے گزر کر آئے تھے غالباً اس کا فطری نتیجہ تھا کہ سخت قسم کا تقشف ان کا نگہبان بن جائے۔ ہم فرنگی محلیوں کا مسلک، یہ کہ سماع، عرس، اور زیارت قبور کے لیے شدِّ رحال وغیرہ کچھ بھی ممنوع نہیں۔ غرض مولانا عنایت اللہ صاحب (فرنگی محلی) اور مولانا دریابادی میں کچھ شعر و شاعری کے مضمرات پہ نوک جھونک ہو رہی تھی۔ مجذوب صاحب نے جب کہا "اب حور بھی آجائے تو ڈالیں نہ نظر ہم"۔ مولانا عنایت اللہ صاحب نے تعریف کرتے ہوئے مولانا دریابادی سے کچھ کہا۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے جواب

ایسے شوخ اشعار مجذوب صاحب کی چلبلی طبیعت نے بہت سے کہے ہیں، اس غزل کا ایک مطلع ہے ؎

جانے تو تھیں دیں گے نہ اب تا بہ سحر ہم | شب ہائے جدائی کی نکالیں گے کسر ہم

پیری میں حسینوں سے لڑائیں تو نظر کیا؟ | دز دیدہ مگر ڈال ہی لیتے ہیں نظر ہم

یہ شوخی ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی جس کی لگام مجذوب صاحب خود بھی کسے رہتے تھے اور جب منہ زوری زیادہ کرنے لگتی تھی تو خود اپنے مرشد (مولانا تھانویؒ) کو اس کیفیت کی اطلاع کرتے تھے وہاں سے مناسب ہدایتیں آجاتی تھیں جس پر مجذوب صاحب عمل پیرا ہو جاتے تھے، وہ زمانہ ان کے لیے سخت مصیبت اور کشاکش کا ہوتا تھا، مرشد کی ایک ہدایت کا علم تو دوسروں کو بھی ہو جاتا تھا یعنی ان کو شعر خوانی کی ممانعت کردی جاتی تھی، دوسروں کے لیے بھی یہ ممانعت مصیبت سے کم نہ ہوتی، لوگ طرح طرح سے اصرار کرتے تھے اور مجذوب صاحب خاموش رہتے۔ لیکن یہ کہتے جاتے تھے کہ "آپ لوگوں کو کیا علم، یہاں کلیجے پر چھریاں چل رہی ہیں"۔

ایک دفعہ یہی "توبہ" کا زمانہ چل رہا تھا، سب لوگ سنانے کا تقاضہ کر رہے تھے کہ ایک صاحب (غالباً مفتی عبدالقادر صاحب فرنگی محلی) نے موقعہ کا شعر پڑھ دیا۔

؎ بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کرکے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

مجذوب صاحب بے قابو ہو گئے، توبہ ٹوٹنے لگی مگر انھوں نے ضبط کیا اور اٹھ کر چل دیے۔ یہ صبح کی بات تھی، شام کو جو آئے تو جھومتے اور رقص کرتے نئی غزل کے ساتھ ؎

ایسے شوخ اشعار مجذوب صاحب کی چلبلی طبیعت نے بہت سے کہے ہیں، اس غزل کا ایک مطلع ہے ؎

جانے تو تھیں دیں گے نہ اب تا بہ سحر ہم — شب ہائے جدائی کی نکالیں گے کسر ہم
پیری میں حسینوں سے لڑائیں تو نظر کیا؟ — دزدیدہ مگر ڈال ہی لیتے ہیں نظر ہم

یہ شوخی ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی جس کی لگام مجذوب صاحب خود بھی کسے رہتے تھے اور جب منھ زوری زیادہ کرنے لگتی تھی تو خود اپنے مرشد (مولانا تھانویؒ) کو اس کیفیت کی اطلاع کرتے تھے وہاں سے مناسب ہدایتیں آجاتی تھیں جس پر مجذوب صاحب عمل پیرا ہو جاتے تھے، وہ زمانہ ان کے لیے سخت مصیبت اور کشاکش کا ہوتا تھا، مرشد کی ایک ہدایت کا علم تو دوسروں کو بھی ہو جاتا تھا یعنی ان کو شعر خوانی کی ممانعت کر دی جاتی تھی، دوسروں کے لیے بھی یہ ممانعت مصیبت سے کم نہ ہوتی، لوگ طرح طرح سے اصرار کرتے تھے اور مجذوب صاحب خاموش رہتے۔ لیکن یہ کہتے جاتے تھے کہ "آپ لوگوں کو کیا علم، یہاں کلیجے پر چھریاں چل رہی ہیں"۔

ایک دفعہ یہی 'توبہ' کا زمانہ چل رہا تھا، سب لوگ سنانے کا تقاضہ کر رہے تھے کہ ایک صاحب (غالباً مفتی عبدالقادر صاحب فرنگی محلی) نے موقعہ کا شعر پڑھ دیا ؎

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

مجذوب صاحب بے قابو ہو گئے، توبہ ٹوٹنے لگی مگر انھوں نے ضبط کیا اور اٹھ کر چل دیے۔ یہ صبح کی بات تھی، شام کو جو آئے تو جھومتے اور رقص کرتے نئی غزل کے ساتھ ؎

سرکاری اعزاز کا جو "خان صاحب" کے خطاب کی شکل میں ملا تھا خود انھوں نے مذاق اُڑایا ہے

بھئے خواجہ صاحب سے ہم خان صاحب   بڑھی خاک عزت گھٹی شان صاحب!

ایک خان بہادر دوست کو خطاب ملنے پر لکھ بھیجا ہے

کیا شان دکھلاتے ہو تم اے خان بہادر   تم خان بہادر ہو ہم ایمان بہادر

شاباش ہو شاباش ہو اے خان بہادر   دنیا پہ کیا دین کو قربان بہادر

محفلوں سے گریز کی ایک وجہ تو اُن کی بے قید و بند طبیعت تھی، دوسری وجہ ایک واقعہ کے بعد ظاہر ہوئی یعنی دوسروں کے ہاں کھانا کھانا اس احتیاط کے پیشِ نظر جو اکلِ حلال کے پابندوں کے لیے ضروری ہوا کرتی ہو مجذوب صاحب پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجذوب صاحب اودھ کے ایک مسلمان تعلقدار کے یہاں زبردستی ہو پہنچائے گئے، جہاں انھوں نے مجبوراً کھانا بھی کھایا، رات بھر کی شعرخوانی کے بعد جب وہ واپس ہوئے تو ایک صاحب سے انھوں نے پوچھ لیا کہ تعلقدار صاحب کی آمدنی میں کوئی ناجائز ذریعہ تو شامل نہیں ہو، اطمینان دلایا گیا کہ وہ سود وغیرہ نہیں لیتے ہیں۔ جزئیات تک مجذوب صاحب نے پوچھ ڈالے اور جب یہ معلوم ہوا کہ لگان وغیرہ کی وصولی میں ان تعلقدار صاحب کے یہاں بھی عام زمینداروں اور تعلقداروں کی طرح کاشتکاروں پر ظلم کیا جاتا ہے تو مجذوب صاحب نے سب کی نظروں سے بچ کر گرم پانی کرا کے استفراغ کیا۔ اور جب اطمینان ہو گیا کہ رات کی غذا کا کوئی ذرہ معدے میں باقی نہیں رہا ہے تو ہلکان ہو کر بستر پر پڑ گئے۔ اس تکان کا علم دوسروں کو بھی ہوا اور بڑی دیر میں تکان کا راز کھُل پایا۔

یہ تو مجذوب صاحب کے لیے معمولی واقعہ تھا، کمال تو یہ کیا انھوں نے کوئی "لے

نے کے بعد نوکری ملی ان کو ڈپٹی کلکٹری کی، کچھ دنوں اس عہدے کو جو آج سے
سال قبل بادشاہی کے مترادف تھا انھوں نے گوارا کیا۔ اس کے بعد انھوں نے استعفا
ردیا، کیوں! اس لیے کہ اس ملازمت میں قانونِ شریعت کے خلاف دوسرے قوانین
، انھیں فیصلے کرنا پڑتے تھے۔

ان کی خدمات حکومت یو۔پی نے محکمۂ تعلیمات کو منتقل کر دیں یہاں اُن کے
عہدے کی تنخواہ ڈپٹی کلکٹری کی تنخواہ سے آدھی تھی مگر وہ راضی اور مطمئن تھے۔
آخر میں جب وہ ایک ڈویژن کے انسپکٹر آف اسکول ہو گئے اور ایک ہزار کے قریب
نخواہ ملنے لگی تو اکثر سنایا کرتے تھے ؎

یش ہو عزت ہو موٹر کار ہے — اور اس دنیا میں کیا درکار ہے؟
س جہاں کی نعمتیں بھی ہوں عطا — اے خدا تیری بڑی سرکار ہے!
